مطبوعات

(اس اشاعت میں ہم چند اہم انگریزی کتابوں کا تعارف پیش کرتے ہیں)

دنیا کی زمام کار اس وقت اہلِ مغرب کے ہاتھوں میں ہے اور وہی پوری نوعِ انسانی کو علمی و فکری غذا فراہم کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اسلامی دعوت کے علمبرداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دورِ جدید کے رجحانات اور مقبولِ عام تحریکات سے اچھی طرح واقف ہوں۔

مغربی تہذیب کے بارے میں جو چیز پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی ترقی اب تنزل کے آغوش میں دم توڑ رہی ہے۔ مغربی مفکرین آج اس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ یورپ کو تباہی اور بربادی سے کس طرح بچایا جائے۔ سائنس کے کمالات نے اہلِ مغرب کے سامنے طریقِ پیدائش کی نئی نئی گرہیں تو کھول دی ہیں مگر انسانیت کے راز ان پر افشا نہیں کیے۔ وہ مادی سامان کی فراوانی کے باوجود آج مضطرب ہیں۔ اسی اضطراب کا اظہار وہاں کے متعدد اصحابِ فکر نے کیا ہے۔ ہم آج ان صفحات میں انہی میں سے چند لوگوں کے خیالات پیش کرتے ہیں:-

۱- ہمارے عہد کا بحران (The Crisis of our Age) مصنف پ۔ا۔ سوروکن P.A. Sorokin ضخامت ۳۳۸ صفحات۔

یہ کتاب پہلی بار نیویارک میں شائع ہوئی اور اکتوبر ۱۹۴۱ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک اس کے نو ایڈیشن نکل گئے۔ اس کا مصنف ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات کا صدر ہے۔ اس سے پہلے وہ عمرانیات کے بین الاقوامی ادارہ کا صدر تھا۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے نہایت ہی ٹھوس اور واضح دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن پر اب نزع کا عالم طاری ہے، اور یہ مصیبت جس میں کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت گرفتار پاتا ہے کوئی آفتِ ناگہانی نہیں ہے بلکہ یہ ایک فطری نتیجہ ہے اُس فکر کا جسے یورپ

نے پچھلے دو سو سال میں جنم دیا۔ اس عالمگیر فساد کا ذکر جن الفاظ میں اُس نے کیا ہے وہ اس قابل ہیں کہ اُن پر نہایت ہی ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔

وہ کہتا ہے :-

"بدیہی شہادتوں کے پیشِ نظر مجھے اس بات کا پُوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ، ہماری تنظیم، ہماری سوسائٹی ایک زبردست بحران سے گزر رہے ہیں۔ جسم کا کوئی حصّہ، قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جو صحیح طور پر کام کر رہا ہو۔ سارے بدن میں ناسور ہیں۔ ہم اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جس کے ایک طرف ماضی کا حسّی تمدن ہے اور دوسری طرف مستقبل کا تصوری تمدن۔ ہم چھ سو سال گزرنے کے بعد اب زندگی کے آخری سانس لے رہے ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی بھولی بھٹکی کرنیں اگرچہ دنیا کو منوّر کر رہی ہیں مگر رات کے تاریک سائے بھی ہر لحہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس شفق میں جبکہ سورج کی بصارت میں کمی واقع ہو گئی ہے ہمارے لیے اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ تاریک رات نوعِ انسانی کو اپنے ڈراؤنے پروں میں چھپانے کے لیے منتظر ہے۔ .... مگر اس تاریکی سے بہت دُور تصوری تمدن کی صبح بھی مستقبل کے انسان کے انتظار میں کھڑی مسکرا رہی ہے"

فاضل مصنّف نے نہایت ہی دیدہ وری کے ساتھ اپنے زمانہ کی خرابیوں اور خامیوں کا احساس کیا ہے۔ اس کی وطن پرستی اندھی نہیں روشن ضمیر ہے۔ وہ دورِ حاضر کی فنی اور صنعتی ترقی اور سائنس کے کمالات سے خیرہ چشم ہو کر کسی خوش فہمی میں گرفتار نہیں ہوا بلکہ اُس نے اپنی قوتِ تنقید کو بیدار رکھا ہے اور ایک ایکس رے ایکسپرٹ کی طرح فساد کے ان مرکزوں کی نشاندھی کی ہے جو اگرچہ دنیا کی نظروں سے مستور ہیں مگر نوعِ انسانی کے جسم کو بیمار اور اُس کے خون کو گندا کر رہے ہیں۔ اُس کے نزدیک یہ فساد ہمہ گیر ہے۔ اور زندگی کے رگ و پے میں پُوری طرح سرایت کر چکا ہے۔ لہٰذا دورِ جدید کا سب سے اہم مسئلہ یہ نہیں کہ نظامِ حکومت کا ظاہری ڈھانچہ کس شکل کا ہونا چاہیے بلکہ سب سے ضروری سوال

یہ ہے کہ فساد کی ان جڑوں کو کس طرح تبدیل کیا جائے جن سے شر کی یہ ساری کونپلیں پھوٹتی اور غذا حاصل کرتی ہیں۔ وہ پورے زور سے کہتا ہے:

"دورِ حاضر کے بحران کی اصل وجہ یہ نہیں کہ اس عہد میں ہٹلر، مسولینی، سٹالن یا چرچل نے جنم لیا۔ یہ لوگ تو اس بحران کی پیداوار ہیں۔ ان کو دنیا کے سٹیج سے ہٹا دینے سے فساد کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ ان کے ہٹنے کے ساتھ ہی ان سے زیادہ شریر لوگ ان کی جگہ پر قابض ہو جائیں گے۔ اگر ہم واقعی اصلاحِ حال چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے فکر و نظر کے زاویوں کو بدلنا چاہیے۔ یہ تبدیلی اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ لوگوں میں اپنی تباہی و بربادی کا ایک شدید احساس پیدا ہو۔ کیونکہ یہ احساس ہی لوگوں کو انقلاب کے لیے سرگرم عمل کر سکتا ہے۔"

اس کے علاوہ وہ لوگوں کی اس غلط فہمی کو بھی دور کرتا ہے جس کا شکار ہو کر لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس حسی تمدن کے علاوہ کوئی جامع تہذیب نہیں۔ اس نے پوری وضاحت سے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس تہذیبِ الحاد کے مقابلہ میں ایک ایسا نظامِ حیات بھی ہے جس کی بنیاد خدا پرستی پر رکھی گئی ہے۔ یہ تمدن کوئی نیا نہیں بلکہ دنیا کئی بار اس کی شعاعوں سے منور ہو چکی ہے۔ اس لیے اگر ہم واقعی اپنے دکھوں کا مداوا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم جدید ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس نئے نظامِ زندگی کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کریں کہ وہ اسے قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے۔

ہمارے نزدیک اس کتاب کا مطالعہ نہایت ہی اہم ہے۔ اس سے یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ دورِ جدید کا انسان اس حسی تہذیب و تمدن کی گرمی سے خوب تپ چکا ہے اور فلسفہ اور سائنس کے صحرا میں کنارے کی شاداب بوں سے گزر کر وسط کی بے آب و گیاہ پہنائیوں تک پہنچنے کے بعد اب اپنے دل میں ایک تڑپ محسوس کر رہا ہے۔ اس کے لبِ مرگ زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں ۔ ع

جگر کی آگ بجھے جس سے وہ شے لا

اسی طرز کی ایک دوسری کتاب انسانِ نامعلوم (Man the Unknown) ہے۔ اس کا مصنف (Alexis Carrel) ماہر حیوانیات ہے۔ یہ شخص پہلے مذہب کو بالکل ایک بیکار سی چیز تصور کرتا تھا مگر ایک مدتِ دراز کی تلاش و جستجو اور غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ دنیا کی نجات اگر کسی ذریعہ سے ممکن ہے تو وہ صرف مذہب کی سچی پیروی ہے۔

نقطۂ نظر کی اس عظیم تبدیلی کا اصلی سبب یہ ہے کہ فاضل مصنف نے ایک گہرے سوچ بچار کے بعد از خود اس بات کو محسوس کیا ہے کہ انسانی اعمال کے محرکات اور اُن کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہیں کہ علمِ کیمیا کی طرح انہیں سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ربط و ترتیب اُسی وقت قائم ہوتی ہے جبکہ ان کے احوال و اسباب کے سلسلے کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نفسیاتی جائزہ میں سائنس کی سی بے لوثی کبھی نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے انسان کی ناکامی کی۔ انسان بے جان اور بے ارادہ مادے کی تحقیق میں تو کامیاب ہو گیا ہے مگر اُسے اپنے آپ کا کوئی "سراغ" نہیں ملا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

"اگرچہ ہم تمام ادوار کے سائنس دانوں، فلسفیوں، شاعروں اور عظیم المرتبت صوفیوں کے مشاہدات کے فراہم کردہ خزانوں کے مالک ہیں مگر ہم ابھی تک انسانی زندگی کے مختصر چند گوشوں کو بے نقاب کر سکے ہیں۔ ہم انسان کو بحیثیتِ کل" کے نہیں سمجھ سکے بلکہ ہم اُسے چند باہم دگر ممتاز اجزا کا مجموعہ سمجھتے ہیں ..... اپنے متعلق ہماری معلومات بہت ہی کم ہیں"

ایک دوسری جگہ وہ سائنس کی ناکامی کا تذکرہ کرتے لکھتا ہے:-

"یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہمارا فکر ہماری زندگی کی پہنائیوں کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتا۔ اُس کے پاس جو پیمانے ہیں اُن سے صرف انہی چیزوں کی پیمائش کر سکتا ہے جو حجم یا وزن رکھتی ہیں، یا زمان و مکان کی حدود میں مقید ہیں۔ سائنس کا دیا ہوا معیار نخوت، نفرت، محبت ایسے احساسات کو جانچنے کے ناقابل ہے"

ڈاکٹر موصوف کے ان بیانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے دورِ جدید کے انسان کی اس جسارت

کو ملاحظہ فرمائیے کہ اُس نے اپنی زندگی کو اچھی طرح سمجھے بغیر محض حواسِ خمسہ کے سہارے اپنا سفر شروع کیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی اس کی بربادی کا اصل سبب ہے۔ ان حالات میں جبکہ انسان کا فکر خود اپنی ذات کے بحرِ بیکراں میں ڈوب کر اس کی وسعتوں کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا یہ ناممکن ہے کہ وہ پوری نوعِ انسانی کے لیے کوئی ایسا لائحۂ عمل پیش کرے جس پر چل کر دنیا کے مختلف انسان خود اپنی زندگیوں کو ہم آہنگ بنا سکیں اور اس طرح پوری نوعِ انسانی اطمینان کا سانس لے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ باہر سے کوئی علیم و خبیر ہستی انسان کی رہنمائی کرے اور یہ ہستی سوائے باری تعالیٰ کے اور کون ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد مصنف نے دورِ جدید کے سب سے بڑے فتنے یعنی ماہرینِ خصوصی Specialists کے فتنہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ عہدِ حاضر کا انسان کس طرح علوم و فنون کے یک چشم ماہرین کے ہاتھوں میں کھلونا بن کے رہ گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"یہ بات اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ زندگی کے کسی ایک شعبہ کو دوسرے کے مقابلہ میں ناجائز اہمیت دی جاتی ہے۔ حالانکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کا مثلاً حیاتیاتی، عضویاتی، نفسیاتی، علمی اور اخلاقی سب کا ایک ساتھ جائزہ لیں۔ آج ہر ماہرِ فن آنکھوں پر تعصبات کی پٹیاں باندھ کر زندگی کو دیکھتا ہے اور اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ تنہا وہی پوری زندگی کو سمجھ سکتا ہے۔ . . . . . بدقسمتی سے "اجزا" کے متعلق یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ وہی درحقیقت کل ہیں اور ان اجزا کا انتخاب بھی کسی گہرے سوچ بچار سے نہیں کیا جاتا بلکہ جو کچھ بھی ہمارے جی میں آتا ہے ہم منتخب کر لیتے ہیں"

اس فساد کا اگر کوئی صحیح علاج ہے تو یہ کہ ایک تو انسان کا بحیثیتِ مجموعی مطالعہ کیا جائے اور دوسرے بنی آدم کی توجہ خارجی دنیا سے ہٹا کر "من کی دنیا" کی طرف مبذول کرائی جائے۔

پچھلے دو صدیوں کے تجربات اس حقیقت کی زندہ شہادت ہیں کہ مشینی ایجادات نے دنیا کو کسی طریقہ سے بھی سکون نہیں بخشا۔ وہ بڑے زور سے کہتا ہے:

"درحقیقت یہ کوئی مفید صورت نہیں کہ ہم ایک ایسے طریقِ زندگی کو اختیار کرنے کے لیے محنت کریں جو اخلاقی زوال کا، اور بڑی بڑی نسلوں کے صالح ترین عناصر کے خاتمہ کا موجب بن رہا ہے۔ تیز رفتار بحری جہاز، آرام دہ گاڑیاں، سستے ریڈیو اور بعید تر سحابیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے طاقتور دوربینیں بنانے کی بجائے ہمیں ان قوتوں کو خود اپنے متعلق غور و فکر میں صرف کرنا چاہیے۔"

"تن کی دنیا" میں انسان کے شدید انہماک کا سب سے بُرا اثر انسانی اخلاق پر پڑا ہے۔ علمی تحقیقات اور صنعتی اکتشافات جن کی غرض نوعِ انسانی کی بہبودی تھی وہ اب اس کی تباہی کا باعث بن گئی ہیں۔ وہ اپنے علم سے حاصل کی ہوئی طاقت کو خود اپنے خلاف ہی استعمال کر رہا ہے۔ لوگوں کے اندر غلط اور صحیح، حق اور ناحق کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔

اِن حالات میں آج اگر انسانیت اپنی فلاح کی طالب ہے تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ ایک سچے مذہب کی طرف رجوع کرے۔ مذہب انسان کے اندر ایک بالاتر ہستی کے وجود کا احساس پیدا کرتا ہے، وہ اُس کی نگاہوں کو آخرت کی زندگی پر مرتکز کر کے اس کی عقل، اُس کی قوت، اور اس کے اخلاق کے درمیان توازن و تناسب قائم رکھتا ہے۔ مذہب ہی ہے جو انسان کے ذاتی فوائد و مصالح کو اجتماعی فوائد و مصالح کے ساتھ مربوط و متناسب رکھتا ہے۔ اسی سے انسان کے اندر اپنی قوت و اختیارات پر بجائے فخر و استکبار پیدا ہونے کے عجز و نیاز اور بندگی کی شان پیدا ہوتی ہے۔

یہ ہے خلاصہ ڈاکٹر موصوف کے خیالات کا۔ اس کی یہ تصنیف اس قابل ہے کہ ہم اس کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔